ڈاکٹر ناہید قمر

صدر شعبہ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

ن م راشد کا شعور وقت

Dr.Nahid Qamar

Head of Urdu Department, Wafaqi Urdu University, Islamabad

Time Perception of Noon Meem Rashid

Noon Meem Rashid is the most significant name of modern urdu poem. Time, although is not the prime subject of Rashid's poetry. But it can not be considered insignificant as it entailed the elementary sketch of his thiought and poetry; and it provides us the outline of almost all the fundamental ideas which ultimately became the building blocks of his poetic pursuits. This article attempts to trace the contours of Rashid's concept of time in his poetry.

عظیم تخلیقات کی ایک خصوصیت فکر کی وہ عمیق سطح ہوتی ہے جو تاریخ کے بہاؤ سے اپنے آپ کو بچا لینے کی طاقت رکھتی ہے۔ زمانے کے نقطۂ نظر سے تاریخ کا ایک دور زمانی لمحات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے لیکن ان لمحات کے درمیان معنوی ربط اس سلسلے کو ایک دور کی صورت عطا کرتا ہے۔ وقت کی جدلیاتی تفہیم میں سلسلہ روز و شب کو ادوار کے تواتر کی صورت میں دیکھا جاتا ہے، لیکن ان مختلف تاریخی ادوار میں جو معنوی ربط پنہاں ہوتا ہے۔ وہ سماجی اداروں سے کہیں زیادہ آرٹ اور فکر کے اعلیٰ نمونوں میں اظہار پاتا ہے۔

اردو شاعری کی روایت میں غالب ایک ایسا شاعر نظر آتا ہے۔ جس نے کائنات کے حوالے سے فلسفیانہ سطح پر وہ سوالات اٹھائے جن کے آگے چل کر اقبال نے اپنی شاعری میں جواب دینے کی کوشش کی۔ اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے وقت کے فلسفے پر مربوط غور و فکر کیا۔ ان کے بعد آنے والے جدید شعراء میں ن م راشد اس حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری میں وقت کے تصور پر تخلیقی واردات اور نظر بحث دونوں حوالوں سے غور و فکر کیا ہے۔ لیکن ان کے تصور وقت کو ان کی شاعری کی داخلی بنت میں تلاش کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اس داخلی بنت میں شاعری کے فنی سانچے اور ان کے تہہ میں کارفرما خیال ایک وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔ ایلیٹ کی رائے میں کسی بھی شاعر کا نقطۂ آغاز اس کے اپنے جذبات ہوتے ہیں، اور شاعر کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی کرب کو غیر شخصی اور آفاقی انداز میں پیش کرے۔ یوں دیکھا جائے تو شاعری اور خصوصاً اعلیٰ شاعری میں فکر اور جذبہ اس طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ انہیں ایک مشکل ذہنی تجزیے کے بغیر الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ورڈزورتھ نے اس رویے کو Recollection of emotions in tranquality کا نام دیا ہے۔ ن م راشد کے ہاں بھی یہی گہری فکر نظر آتی ہے جو شخصی علامتوں کو غیر شخصی اور آفاقی نوعیت کا درجہ دے دیتی ہے۔ اسی وجہ سے قاری اور شاعر کا ذہنی

فاصلہ برقرار رہتا ہے۔ جو اگر معین یا ختم ہو جائے تو شاعری کی علامتی قدر محدود ہو جاتی ہے۔ (جذبے کی غیر مرفع ترسیل کی علامتی قدر اسی لیے محدود ہوا کرتی ہے) لیکن جہاں یہ فاصلہ غیر معین رہتا ہے وہاں تخلیق کی علامتی قدر بڑھ جاتی ہے اور اس کی نئی تعبیری بھی ممکن ہوتی ہے۔ اس خصوصیت کے باعث ایک شاعر مختلف تاریخی ادوار کا ہم عصر بنتا ہے۔ اس کے برعکس وہ شاعر جو اپنے ہم عصر قاری سے ایک معین ذہنی فاصلے کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی زندگی کا المیہ ان کی موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ان کی زندگی کا نہیں ان کے فن کا المیہ ہوتا ہے۔ جذبے اور فکر کی اس غیر متوازن تقسیم کا سبب شاید وہ رجحان ہے جسے رلکے نے اشیاء کو نفاست کے ساتھ علاحدہ علاحدہ کرنے کی انسانی غلطی کا نام دیا ہے۔

راشد کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے اور قاری کے درمیان ذہنی فاصلے کو ہمیشہ غیر معین رکھا، اس لیے ان کے کلام کی علامتی قدر زیادہ ہے، اور اسی بنا پر ان کے کلام کی مختلف تعبیریں بھی ممکن ہیں۔ لیکن تعبیر کی صحت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ کہاں تک راشد کے مجموعی کلام سے ہم آہنگ ہے۔ راشد کی فکر کی بلندی اور بظاہر پستی بھی صرف فکر کی بلندی و پستی نہیں، بلکہ انسانی موقف کے فطری اعلیٰ اور پست لمحوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ راشد کے اکثر شارحین نے جن زاویوں سے راشد کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی، ان میں راشد کا بنیادی وژن فراموش ہو گیا۔ راشد کی شاعری میں روایت کی دھیمی لے کی بجائے بغاوت کے تیور نظر آتے ہیں، مگر یہ بغاوت صرف فنی سطح پر نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک حساس دل کا وہ داخلی کرب بھی شامل ہے جو قدروں کی شکست و ریخت اور ملک پر سامراجی تسلط کے خلاف شدید احتجاج لیے ہوئے تھا۔ گویا یہ داخلی ٹوٹ پھوٹ کی زد میں آئے ہوئے اس شخص کے باطن کا عکس ہے جو تاریخ کے دو مختلف و متصادم ادوار کے مابین اپنی شناخت کا سرا تلاش کر رہا تھا۔ راشد کی شاعری جنگ عظیم کے بعد کے شاعری ہے۔ بظاہر یہ زمانہ انقلاب کا ہے۔ اس دور میں ایشیاء کے اکثر حصوں میں صنعتی، معاشرتی اور سیاسی بیداری کے آثار نمودار ہوئے۔ ہندوستان میں بھی بیشتر شعراء کے ہاں ایک سطحی جذباتی قسم کی وطن پرستی کے جذبے کے تحت ایک نئے دور کی آمد کے خواب دیکھے اور دکھائے جا رہے تھے۔ لیکن راشد کو یہ سب ولولے اور ہنگامے عارضی اور بے معنی محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں ارض مشرق کی روح مردہ ہو چکی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں اس اعصابی تھکن، ذہنی جمود، شکستہ ایمان اور شدید احساس کمتری کا پتہ چلتا ہے جو صدیوں سے ارض مشرق پر طاری ہے۔

''اس مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک پنہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت ادس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی'' ۱ (دریچے کے قریب)

''بس ایک زنجیر

ایک ہی آہن کمند عظیم
پھیلی ہوئی ہے
مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک
مرے وطن سے ترے وطن تک
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں''۲ (من وسلویٰ)

راشد کا پہلا اور بنیادی سروکار باہر کی دنیا کے اس ردعمل سے تھا جو باطن کی سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ اس وژن سے تھا جو شخص ہوتا ہے اور جس کی اساس خواہ اجتماعی ہو مگر جو اپنی ہستی کے حوالے سے اس کے معنی متعین کرتا ہے۔ جو اپنے عہد کے آشوب اور اپنے انفرادی اندوہ کا علاج ڈھونڈنے سے زیادہ اس آشوب اور اندوہ کو عام انسان تاریخ کے واسطے سے، اپنے ماحوال کے واسطے سے اور آنے والے زمانوں سے منسلک اندیشوں اور امکانات کے واسطے سے سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کی ماہیت تک پہنچنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راشد کے ہاں معروضی سوالات کے حوالے سے شدید نا آسودگی اور عدم اطمینان ملتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ تاریخ کے جس دور میں ہم زندہ ہیں یہ انسانی پستی کا بدترین دور ہے جس میں انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور زندگی کے حسن کو کچل کے رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ادراک ان کے لہجے میں کس قدر طنز کی آمیزش کر دیتا ہے۔

''اے فلسفہ گر
کہاں وہ دریائے آسمانی۔۔۔۔۔؟
کہاں وہ نمرود کی خدائی۔۔۔۔۔؟
تو جال بنتا رہا ہے جن کے شکستۂ تاروں سے اپنے موہوم فلسفے کے
ہم اس یقین سے، ہم اس عمل سے، ہم اس محبت سے آج مایوس ہو چکے ہیں''۳ (نمرود کی خدائی)

شمیم حنفی نے راشد کی فکر کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مضمون ''ن م راشد زندگی کی مساوات میں ایک گمشدہ ہندسے کی تلاش'' میں لکھا ہے۔

''راشد اپنی تیسری آنکھ ہمیشہ کھلی رکھتے ہیں۔ محض دو آنکھوں کی زد میں آنے والے تماشائے دید و دانش پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اور یہ جانتے ہیں کہ ہر انسانی تجربے کی تکمیل کا آخری منطقہ اس تجربے سے ایک فرد کے طور پر، ہماری وابستگی فراہم کرتی ہے۔ راشد کی شاعری یقین کے بجائے ایک مستقل شک کی سرزمین سے ابھری تھی۔ چنانچہ راشد کے یہاں مسلمات سے، بنے بنائے مفروضات سے، مذہبی، سیاسی، معاشرتی قدروں کے مروجہ تصورات سے ایک شعوری گریز کا احساس ملتا ہے''۴

وقت کے حوالے سے راشد کا تصور نظریاتی ہے۔ وہ ماضی کو نہ صرف نظریاتی حوالے سے رد کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ماضی کی تہذیب و ثقافت کو بھی پرانے افکار کی تخلیق سمجھتے ہیں۔

''مجھے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں خواہ وہ کسی رنگ میں کیوں نہ نمودار ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اصل مسئلہ آئندہ ہزاروں سال کا ہے

گزشتہ ہزاروں سال کا نہیں۔ ماضی کے اندر یا ماضی کے جمع کیے ہوئے تجربات کے اندر آئندہ مسائل کی کلید کہیں موجود نہیں۔ اس تیز رو اور گریز یا حال میں ماضی کا کوئی تجربہ ہمارا دستگیر نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ ماضی کے پرستار ہیں اور ماضی کی امانتوں کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں وہ محض سہل انگار ہیں'' ۵

یہی وجہ ہے کہ راشد کی شاعری میں ماضی مستقل طور پر لاحاصلی، انفعالیت اور بے معنویت کی علامت ہے۔ جہاں جہاں بھی ماضی کا حوالہ آیا ہے۔ اس سے انحطاط اور بے معنویت ہی کا تصور وابستہ نظر آتا ہے۔ مثلاً راشد کی نظم ''صباویراں'' تاریخ کے لمحۂ زوال کی داستان سناتی ہے۔ زوال، جو اپنے پیچھے تاریخ کا المیہ چھوڑ گیا ہے۔ ''زندگی اک پہرہ زن'' بھی ایک ایسی ہی نظم ہے۔

''زندگی تو اپنے ماضی کے کنویں میں جھانک کر کیا پائے گی؟
اس پرانے اور زہریلی ہواؤں سے بھرے سونے کنویں میں جھانک کی اس کی خبر کیا لائے گی؟_____
اس کی تہہ میں سنگریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں
جز صدا کچھ بھی نہیں'' ۶

راشد نے اس نظم کے حوالے سے ڈاکٹر آفتاب احمد کے نام اپنے ایک خط میں درج ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔

''زندگی ہے پہرہ زن، شروع تو اس عام مشاہدے سے ہوئی تھی جو تمہیں بھی بارہا پیش کیا ہوگا یعنی گلی میں کاغذ اور دھجیاں جمع کرتی ہوئی کوئی دیوانی بڑھیا_____ زندگی کے ساتھ اس کی تشبیہ کا خیال ذاتی حادثے کی بنا پر نہیں آیا بلکہ اس سوچ کی بنا پر جو مجھے اکثر مضطرب رکھتی ہے کہ ہم کس قدر ماضی پرست لوگ ہیں۔ ماضی کے سرمایے کو کس قدر سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اس کے پیچھے کس قدر دیوانہ وار دوڑتے ہیں، ہانپتے ہیں، پھر نگاہیں اپنے ہی قدموں تک آ کے رک جاتی ہیں۔ کیونکہ وہاں صرف اپنی ہی تہذیب پرانا، گہرا، سونا کنواں ہے۔ جس میں سنگریزے پڑے ہیں اور جس میں اپنی صدا گونج کر رہ جاتی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ماضی پرستی دیوانگی سے کم نہیں'' ۷

راشد کے کلام میں وقت کا شعور وجودی حوالے سے بھی آیا ہے اور وجودیت کے مضمرات کے کلام میں پیدائش اور موت مسئلہ، کائنات کی لامحدود وسعت، وقت کے تناظر میں انسان کا مقام، انسان کی کم ادراکی اور وجودیت کا بنیادی مسئلہ یعنی انسانوں کی داخلی تنہائی شامل ہے۔ کلاسیکی ادب میں تنہائی کا تصور اس لحاظ سے مختلف تھا کہ اس میں تنہائی کا تصور مرکزیت کا حامل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ تنہائی کے احساس سے نجات کے راستے بھی موجود ہیں۔ خدا سے رجوع اور زندگی کی گم شدہ اقدار و روایات کی بازیافت تنہائی سے نجات کی صورتیں پیدا کرتی ہے۔ یوں تنہائی کی حیثیت ایک جزوی صداقت کی ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس میکانکی سماج میں تنہائی کلی صداقت کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ اس کا تعلق فرد کے داخل سے ہے۔ راشد کے یہاں یہ مسئلہ اسی حوالے سے ان کے تخلیقی شعور کا حصہ بن کر ان کی شاعری میں آیا ہے۔ جس کی ایک اہم مثال ان کی نظم ''اسرافیل کی موت'' ہے۔ اسرافیل اور اس کے صور سے وابستہ تصورات سے قطع نظر کرتے ہوئے راشد نے اسے آواز کا فرشتہ اور اس کی موت کو ہر قسم کے تخلیقی اظہار کی موت قرار دیا ہے۔

''مرگ اسرافیل سے
اس جہاں کا وقت جیسے کھو گیا پتھرا گیا
جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا

ایسی تنہائی کہ حسن نام یاد آتا نہیں
ایسی تنہائی کہ اپنا نام یاد آتا نہیں''۸ (اسرافیل کی موت)

یہ وجودی آہنگ اس انسان کی احساساتی اور جذباتی موت کا نوحہ ہے جو آج کے بے چہرہ معاشرے میں اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے۔تاہم راشد کی وہ نظمیں جن میں شعور وقت کے حوالے سے گہرا تفکر اور ارتکاز ملتا ہے۔زمانہ خدا ہے ان میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

''زمانہ خدا ہے
اسے تم برا مت کہو
مگر تم نہیں دیکھتے، زمانہ فقط ریسمان خیال
سبک مایہ، نازک، طویل
جدائی کی ارزاں سبیل
وہ محبتیں جو لاکھوں برس پیشتر تھیں
وہ شامیں جو لاکھوں برس بعد ہوں گی
انہیں تم نہیں دیکھتے، دیکھ سکتے نہیں
کہ موجود ہیں اب بھی موجود ہیں وہ کہیں
مگر یہ نگاہوں کے آگے جو رسی تنی ہے
اسے دیکھ سکتے ہو، اور دیکھتے ہو

"And time future in time past
if all time is eternally present
All time is unredreamable
What might have been is an abstraction
Remaining a perpetual possibility
only in a world of speculation
what might jhave been and has been
point to one end,which is always present."

اس روحانی حقیقت کا عرفان راشد کے Vision میں موجود ہے جو زمانے کے تمام تعبیرات کے عقب میں کارفرما ہے۔لیکن فی نفسہ ابدی اور غیر متغیر ہے۔تاہم شعور وقت کے حوالے سے راشد کا وژن واضح ترین صورت میں ان کی نظم ''حسن کوزہ گر'' میں سامنے آتا ہے۔چار حصوں پر مشتمل اس نظم میں گم شدگی اور بازیافت کی ایک ایسی کیفیت ہے کہ یوں لگتا ہے ہم کئی زمانوں میں سانس لے رہے ہیں''

''زمانہ جہاں زادرہ چاک ہے جس پہ مینا و جام و سبو

اور فانوس وگلداں
کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انسان''۱۲ (حسن کوزہ گر۱)

''وقت کیا چیز ہے تو جانتی ہے
وقت اک ایسا پنکھا ہے
جو دیواروں پہ، آئینوں پہ
پیمانوں پہ، شیشوں پہ
سدا رینگتا ہے
رینگتے وقت کے مانند کبھی

لوٹ کے آئے گا حسن کوزہ گر سوختہ جاں بھی شاید''۱۳ (حسن کوزہ گر۲)

''حلب کی کارواں سہر کے حوض کا نہ موت کا
نہ اپنی اس شکست خوردہ ذات کا
اک انتظار بے زماں کا تار ہے بندھا ہوا
کبھی جو چند ثانیے زمان بے زماں میں آ کے رک گئے

تو وقت کا یہ بار میرے سر سے بھی اتر گیا''۱۴ (حسن کوزہ گر۳)

''جہاں زاد کیسے ہزاروں برس بعد
اک شہر مدفون کی ہر گلی میں
مرے جام و مینا و گلداں کے ریزے ملے ہیں

کہ جیسے وہ اس شہر برباد کا حافظہ ہوں'' ۱۵ (حسن کوزہ گر۴)
''زمانہ جہاں زاد افسوں زدہ برج ہے

اور یہ لوگ اس کے اسیروں میں ہیں''۱۶ (حسن کوزہ گر۴)

''زمانہ جہاں زاد میں نے ___ حسن کوزہ گر نے

بیاباں بیاباں یہ دردِ رسالت سہا ہے'' ۱۷ (حسن کوزہ گر ۴)

اور زمانے کے لوگوں کے بارے میں راشد کہتے ہیں کہ

''یہ فن کی تجلی کا سایہ کہاں پا سکیں گے
جو بڑھتا گیا ہے زماں سے زماں تک
خزاں سے خزاں تک
جو ہر نوجواں کوزہ گر کی نئی ذات میں
اور بڑھتا چلا جا رہا ہے
وہ فن کی تجلی کا سایہ کہ جس کی بدولت
ہمہ عشق ہیں ہم
ہمہ تن خبر کہ
خدا کی طرح اپنے فن کے خدا سر بسر ہم'' ۱۸ (حسن کوزہ گر ۴)

یہاں وقت کا تصور ان واحد (Elar Vital) کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ برگستاں کے اس نظریے کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ وقت کی رو کہیں منقطع نہیں ہوتی اور جو کچھ بھی ہے وہ ایک ابدی اب میں موجود ہے۔ یعنی وقت میں جو ایک تغیر کا جاودانی عنصر ہے، اس تغیر میں کئی جہان پوشیدہ ہیں۔ اس اعتبار سے انسان لمحۂ موجود کی افقی اور عمودی دونوں جہات سے بیک وقت مربوط ہے اور اس کے لئے لمحہ حاضر وہ گریزاں سرحد ہے جس کے سرے گذشتہ اور آئندہ زمانوں میں پشیمان خیال کے ذریعے پیوست ہیں۔ اس طرح حال کے اندر زندگی اور کائنات کی تخلیق وارتقاء اور ممکنات سب موجود نظر آتے ہیں۔ راشد نے شہر برباد کے حافظے کی مناسبت سے دجلہ اور فرات کا حوالہ دے کر در حقیقت اپنے تہذیبی لاشعور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ گزرا ہوا وقت ختم نہیں ہوتا، بلکہ حال میں زندہ رہتا ہے۔ اور تہذیبی کھنڈرات صرف خارج کی دنیا میں ہی موجود نہیں ہوتے بلکہ نسل در نسل انسانی سماج کے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں اور ادب ان اجتماعی لاشعوری تجربات کی بازیافت سے ایک گم شدہ ماضی اور غیر یقینی مستقبل میں تاریخ کے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹ کر اپنی روحانی اور جمالیاتی دنیا کو نئے سرے سے دریافت کرتا ہے۔ اس عمل میں وقت کی حد بندیوں میں داخلی کرب کے تحت Blue ہونے کا احساس نہ صرف فن پارے کی فکری گہرائی میں اضافہ کرتا ہے بلکہ داخلی سطح پر نئے طرزِ اظہار کو راہ بھی دیتا ہے۔ نظم کے چار حصوں میں حسن کی باطنی دنیا کی تقلیب دکھائی گئی ہے، جو خارجی کائنات کا تلازمہ بن جاتی ہے۔ اور جس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ حافظہ ہمارے وجود پر محض ماضی کا ایک نقش نہیں بلکہ اس معنی کا گہوارہ ہے جس سے ہماری امیدوں، آرزوؤں اور خوابوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس نظم کا مطالعہ یک زمانی اور تاریخی دونوں سطحوں پر کیا جا سکتا ہے، کیونکہ تاریخیت سے مراد انسانیت کا وہ اجتماعی حافظہ ہے جو عمل کے تسلسل اور ترسیل معنی کی

ضمانت مہیا کرتا ہو۔حسن کوزہ گر۴ میں راشد نے اس طویل نظم کا اختتامیہ لکھا ہے۔اس حصہ نظم میں انہوں نے تحقیق اور تخلیق کار کو زمان و مکاں کی حدوں سے ماورا کر دیا ہے۔نظم کی ایک سطح تو یہ ہے کہ دیگر علوم حقیقت کو اجزاء میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں جس کے باعث وہ حقیقت کی کلی تفہیم سے قاصر رہتے ہیں۔جبکہ تخلیقی عمل کے ذریعے اجزاء میں بنی ہوئی حقیقت کو ایک کل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔دوسری سطح یہ ہے کہ زندگی اور حقیقت کو دیکھنے کا غیر تخلیقی انداز حقیقت تک رسائی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔اس لیے ماضی کو ''داستان فنا کے وغیرہ وغیرہ'' سمجھنے کے بجائے ایک زندگہ وجود سمجھنا چاہیے۔کیونکہ ماضی اپنے اندر بہت سی ایسی روایتیں سمیٹے ہوئے ہوتا ہے جو آنے والے وقتوں کے لیے نشان راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

نظم میں ابدیت کی طرف بڑھتا وقت زندگی اور اس کے مظاہر پر اپنے اثرات ثبت کرتا چلا جاتا ہے۔نظم میں حسن اور جہاں زاد کی صورت میں فن اور تخلیق فن کی علامات کو برتا گیا ہے۔اس کے علاوہ سمندر کی اساطیری علامت بھی کوئی ہے جو لازمانیت اور ابدیت کی علامت ہے۔ڈرامائی خود کلامی کی تکنیک پر مبنی یہ نظم یونیورسل کینوس پر لکھی گئی ہے۔اس میں وقت کے چار زمانی ادوار اور چار تہذیبوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔چار کے ہندسے کی تکرار سے قدیم ایران کے عقیدۂ زمان کی طرف دھیان جاتا ہے جس کے مطابق کائنات کی عمر بارہ ہزار سال ہے جو تین تین ہزار سال کے چار ادوار پر مشتمل ہے۔لیکن حسن کوزہ گر کا بنیادی موضوع یا دوسرے لفظوں میں راشد کے تصور وقت کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تخلیق کار جس لازمانیت میں سانس لیتا اور اپنے فنی تجربے کی تکمیل کرتا ہے اس میں ماضی، حال اور مستقبل ایک ہو جاتے ہیں۔وقت کے آغاز سے انجام تک موجو ہرنے کا احساس ایک روحانی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ جہاں لامحدود سے ہم آہنگ ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ اپنی ذات کو اس میں ضم کر دیا جائے، وہاں ایک طریق یہ بھی ہے کہ خود کو اتنا پھیلا دیا جائے کہ ذات اور کائنات میں کوئی فاصلہ ہی باقی نہ رہے۔راشد کا شعور وقت اسی نوع کا ایک تجزیہ ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ کلیات راشد ن م راشد، ماروا پبلشرز، لاہور بار دوم ۱۹۹۱ء ص ۹۷

۲۔ ایضاً ص ۱۹۱، ۱۹۲

۳۔ ایضاً ص ۱۵۳۔۱۵۴

۴۔ خیال کی مسافت، شمیم حنفی، شہزاد کراچی ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۴

۵۔ لا انسان، ن م راشد، المثال لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۲۷

۶۔ کلیات راشد ص ۹۷

۷۔ ن م راشد شخص اور شاعر، ڈاکٹر آفتاب احمد، ماورا پبلیشرز لاہور ۱۹۸۹ء ص ۱۲۶، ۱۲۷

۸۔ کلیات راشد ص ۳۰۰

۹۔ ایضاً ص ۳۴۶، ۳۴۷

۱۰۔ راشد کے خطوط مرتبہ نسیم عباس احمد، رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور ۲۰۰۸ء ص ۱۸۴

۱۱۔ http://www.tristan.icom43.net/quatets/salvages.html

۱۲۔ کلیات راشد ص ۲۵۷، ۲۵۸

۱۳۔ کلیات راشد ص ۴۴۵

۱۴۔ ایضاً ص ۴۹۳

۱۵۔ ایضاً ص ۵۴۲

۱۶۔ ایضاً ص ۵۴۴

۱۷۔ ایضاً ص ۴۴۵

۱۸۔ ایضاً ص ۵۴۶، ۵۴۷

کتابیات

۱۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر ن م راشد شخص اور شاعر لاہور، ماورا پبلیشرز، ۱۹۸۹ء

۲۔ راشد، ن م کلیات راشد لاہور ماورا پبلیشرز بار دوم ۱۹۹۱ء

۳۔ راشد، ن م لا=انسان لاہور المثال ۱۹۶۹ء

۴۔ شمیم حنفی خیال کی مسافت کراچی شہرزاد ۲۰۰۴ء

۵۔ نسیم عباس احمد راشد کے خطوط (مرتبہ) لاہور رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی ۲۰۰۸ء

۶۔ http://www.tristan.icom43.net/quatets/salvages.html